پاکستانی داستانوں میں معاشرت، سیاسی روّیوں اور رجحانات کی عکاسی

راؤ رفعت ریاض، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، خانیوال

Abstract

The tradition of Dastan Nigari is very old. During the 20th century Dastan Nagari reached its climax and a great many prose and poetic forms of Dastan emerged. But near the end of the 20th century this tradition gradually declined. To research the traces of this tradition during the initial decades of the 21st century is a difficult task. In Pakistan, this tradition took a rebirth during the second half of the 20th century. Now the tradition and disposition of "Dastan" had changed. In these (tales) Dastan modern scientific techniques and equipment had taken the place of supernatural characters. But inspite of this, like old Dastan these also seemed to be reflecting the culture of the land. These Dastan beautifully reflect Pakistani ways of living, social behaviors and tendencies. This research is a political and social case study of Dastan written in Pakistan.

اُردو نثر کی شاہ راہ پر داستان کی حیثیت سنگِ میل کی سی ہے۔ داستان کی رنگین و دل کش دُنیا نے عرصہ دراز تک لوگوں کو اپنا گرویدہ بنائے رکھا، لیکن وقت کے بدلتے تقاضوں نے بہت سی چیزوں کو بدل رُک رکھ دیا۔ انگریزوں کے اقتدار میں آنے کے بعد اُردو ادب میں بھی نئے تقاضے اور نئے رجحانات سامنے آئے۔ درباروں کی رونقوں کی رُخصتی کے ساتھ ہی داستان بھی رُخصت ہوئی جسے ''سہیل بخاری'' نے داستان کا جنازہ نکلنے سے تعبیر کیا ہے۔[۱] بیسوی صدی کے نصف اوّل میں تو اس کے نشان ڈھونڈے نہیں ملتے۔ اس نصف صدی میں داستان نگاری کے حوالے سے ایک مہیب سناٹے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس نصف صدی میں داستانوں کے قدردان اور قدرشناسوں کا فقدان محسوس ہونے لگا۔ قدیم دستانوں کا ضخیم اور قیمتی سرمایہ طاق نسیاں کی زینت بن کر رہ گیا، بدلتے حالات یہ ثابت کر رہے تھے کہ یہ صنف زمانے کی تیز رفتاری کا ساتھ نہیں دے سکتی، یہ ایسی زندگی کی ترجمان ہے جس کا حقیقت کی دُنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تخیل کے زور پر بسائی گئی پریوں اور جادوگروں کی دُنیا غیر فطری ہے، لیکن یہ تخیل کی دُنیا اپنے اندر بھرپور کشش رکھتی ہے۔ بقول بانو قدسیہ:

> ''اس سائنسی دور میں بھی انسان اسرار سے محبت کرتا ہے اَن دیکھی، اَن چاہی، اَن سمجھی منزلیں اُسے کھینچتی ہیں۔''[۲]

ہر زمانے کے لوگوں کو داستانیں سننے اور پڑھنے سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ قدیم دور کا باشندہ ہو یا جدید دُنیا کا انسان داستان سے اُس کی وابستگی ہمیشہ سے تھی اور رہے گی۔ آرزو چودھری کی یہ رائے درست ہے:

> ''داستان اصل میں ایام رفتہ کی انسانی آتما کی ندا اور انسانی دلوں کی آواز ہے۔ ایسی آواز جس کی بازگشت ہر دل اور ہر ذہن کے ایوان میں ہزارہا برسوں سے سنائی دے رہی ہے اور جب تک نسلِ انسانی باقی ہے سنائی دیتی رہے گی۔''[۳]

داستان دل کو موہ لینے والی صنف ادب ہے۔ ہر عہد کے تقاضوں کے مطابق داستان کی زندگی کو جِلا ملتی رہی ہے۔ بیسویں صدی کی دوسری نصف صدی میں اُردو داستان کو دوسرا جنم ملا۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد یہ صنف نثر اپنے سفر کا آغاز نئے سرے سے کرتی ہے۔ پاکستان میں اُردو داستان نگاری کا آغاز ۷۰ (ستّر) کی دہائی میں ڈائجسٹ کے ذریعے ہوتا ہے۔ ان ڈائجسٹوں میں چھپنے والی مختصر اور طویل داستانوں نے لوگوں کی کثیر تعداد کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ مختلف ڈائجسٹوں کی مانگ میں روز بہ روز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ڈائجسٹوں میں چھپنے والی ان داستانوں کو عوام کی بڑی تعداد شوق سے پڑھتی اور اگلی قسط کے شائع ہونے کا انتظار کرتی تھی۔

سب سے پہلے ''عالمی ڈائجسٹ'' میں بہزاد لکھنوی نے ''کالا ایلم''، ''اگیا بیتال'' اور ''کالی مائی'' جیسی کہانیاں داستانوی انداز میں لکھیں۔ پھر ''سونا گھاٹ کا پجاری''، ''اِنکا''، ''اقابلا''، ''بازی گر''، ''طالوت''، ''مفرور''، ''دیوتا''، ''گمراہ''، ''شکاری'' اور ''موت کے سوداگر'' جیسی مقبول داستانیں ''سب رنگ''، ''جاسوسی'' اور ''سسپنس'' ڈائجسٹ میں لکھی گئیں۔ یہ سب پاکستانی داستان نگاروں کی طبع زاد داستانیں ہیں۔

پاکستان میں لکھی جانے والی اِن داستانوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان داستانوں کے لکھنے والوں نے اس بات کا ادراک کر لیا تھا کہ اب داستان کو سجانے اور سنوارنے کے لیے کِن کِن لوازمات کی ضرورت پڑے گی۔ داستان کے نئے چہرے کے نقش و نگار کیسے ہونے چاہئیں۔ ان داستان نگاروں نے داستان کی بنیادی خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے داستان کو جدید عصری تقاضوں سے بڑی خوب صورتی کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا۔ جس سے عوام کی دلچسپی بڑھ گئی۔ ان داستانوں میں پاکستان کے سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔

طویل داستانوں میں ''بازی گر'' سب رنگ ڈائجسٹ میں چھپتی رہی، لیکن اس کی فضا خالص ہندوستانی ہے۔ ''بازی گر'' کے بعد لکھی جانے والی داستانوں ''مفرور'' (جاسوسی)، ''دیوتا'' (سسپنس)، ''گمراہ'' (جاسوسی)، ''شکاری'' (جاسوسی) اور ''موت کے سوداگر'' (سسپنس) میں خاص طور پر پاکستان کے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے۔

''مفرور'' داستان کا ہیرو ''صفدر علی'' ہے۔ اس کی ملاقات یمن میں ایک بدنام پاکستانی ''عبداللطیف'' سے ہوتی ہے، لیکن ''عبداللطیف'' اپنی اصل حقیقت، اپنے خاندان کے قتل اور پاکستان میں قانون کی عمل داری کے بارے میں اپنے دُکھ اور کرب کا اظہار یوں کرتا ہے:

> ''لنگڑا لولا اور مفلوج قانون بھی ان سب کا کچھ نہ بگاڑ سکا، نہ آلات قتل برآمد ہوئے تھے اور نہ میرے سوا

کوئی بالغ چشم دید گواہ تھا۔ ڈیڑھ سال تک خاک چھاننے کے بعد مجھے اس خبر نے چراغ پا کر دیا کہ وہ سب عدم ثبوت کی بناء پر بَری کر دیئے گئے تھے۔''[۴]

پاکستان میں اگر راہ چلتے کوئی حادثہ ہو جائے تو زخمی کی جیب صاف کر لی جاتی ہے۔ ''مفرور'' میں جب ''صفدر علی'' زخمی ہو جاتا ہے تو اس کی جیب کاٹ لی جاتی ہے۔ اس منظر کو داستان کی ہیروئن ''سیتا'' یوں بیان کرتی ہے:

''اسی بھیڑ میں کسی نے تمھیں اُٹھانے کے بہانے جیبیں صاف کر دیں غنیمت ہوا کہ پاسپورٹ وغیرہ ہوٹل میں تھے ورنہ وہ بھی صاف ہو جاتے۔''[۵]

''گمراہ'' میں بھی پاکستان کے مسائل اور معاشرے کی کمزوریوں کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ ہمارے معاشرے میں وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم نے عوام کی ایک بہت بڑی تعداد کو بھوک و افلاس میں مبتلا کر رکھا ہے، بھوک سے بلکتے بچوں کا پیٹ عورتیں اپنے جسم کا سودا کر کے بھرتی ہیں۔ اس کی عکاسی یوں کی گئی ہے:

''وہ لڑکی واقعی حسین تھی بے حد حسین مگر صرف چہرے کی حد تک، اس کا باقی بدن بالکل مرجھلا سا نظر آتا تھا، ہڈیوں کی موٹھ دکھائی دیتا تھا۔ وہ شدید فاقوں کی ماری ہوئی تھی بہت نحیف و نزار تھی، اتنی کمزور کہ اس کے ہاتھوں پر نیلی نیلی رگیں اُبھر آئی تھیں۔ عمر اس کی یہی کوئی سولہ سترہ سال ہو گی مگر مناسب خوراک نہ ملنے کی وجہ سے اس کا بُرا حال ہو چکا تھا اور اس رات شاید پہلی بار روپیہ کمانے نکلی تھی۔''[۶]

قیامِ پاکستان کے روزِ اوّل سے ہی اکثر پاکستانی سیاست دان اپنے مفاد کے لیے ہر مذموم کام کرنے میں پیش پیش رہے ہیں۔ اپنی سیٹ پکی کرنے کے لیے مخالف اُمیدوار کی جان سے کھیلنا اُن کے لیے کوئی بُرا کام نہیں ہوتا۔ مفرور مجرموں کو پناہ دینا اور اُن کی سرپرستی کرنا ان کے لیے دلچسپ مشغلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ سیاسی اکھاڑ پچھاڑ اُن کا وطیرہ ہے۔ ''گمراہ'' میں اسی قسم کی سیاسی ریشہ دوانیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ''بڑے صاحب'' اپنے مقابلے میں کھڑے ہونے والے ''چوہدری ہادی'' کو اپنے راستے سے ہٹا کر اپنا رستہ صاف کرنا چاہتے ہیں۔ داستان کے ہیرو ''غلام جیلانی'' کو اس کے سیاسی آقا اس انداز میں یقین دلاتے ہیں:

''بڑے صاحب کے مشیر سے مل کر آ رہا ہوں، اگر آپ ان کے کہنے کے مطابق عمل کریں تو آپ کو دوہرا فائدہ ہو گا، آپ کو بھی زندوں کی فہرست سے نکال کر مردہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ کسی پولیس مقابلے میں مرے ہوئے کسی اور آدمی کی لاش کو آپ کی لاش ثابت کر کے یہ مشہور کر دیا جائے گا کہ غلام جیلانی پولیس مقابلے میں مارا گیا۔''[۷]

جاگیردارانہ سوچ پاکستانی معاشرے کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ پاکستان کے جاگیردار، نواب، وڈیرے اور پتھاریدار بااثر اور طاقت ور ہیں۔ اس طبقے نے ریاست کے اندر ایک اور ریاست بنا رکھی ہے جس میں صرف اور صرف انہیں کا حکم چلتا ہے۔ ان کے فیصلوں سے کوئی منہ نہیں موڑ سکتا۔ پاکستانی عوام ان کے ظلم و ستم خاموشی سے سہہ رہی ہے۔ ''گمراہ'' میں ایسے ہی بدکردار ''چوہدری کرامت'' کو ''غلام جیلانی'' کیفرِ کردار تک پہنچاتا ہے تو ''غلام جیلانی'' کے اس کارنامے کو یوں سراہا جاتا ہے:

''آپ نے کمال کر دیا جیلانی صاحب۔ اس خبیث سے تو سارا قصبہ عاجز ہے۔ اس نے میرے سکول کی ایک اُستانی کو پچھلے سال اغواء کر لیا تھا۔ اس کی ابھی تک کوئی خبر نہیں ملی ہے۔ بہت ذلیل آدمی ہے یہ پانچوں عیب شرعی اس میں موجود ہیں۔ پہلے یہ خود لڑکیوں کی عزت لوٹتا ہے پھر اُن کو اپنے نوکروں کے حوالے کر دیتا ہے۔''[۸]

یہ ظالم جاگیردار غریبوں کی عزت پامال کرتے ہیں۔ اس صورتِ حال پر ''غلام جیلانی'' اپنے دُکھ اور کرب کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

''افلاس کے مارے مزارعوں اور کمیوں کی بہو بیٹیاں خدا جانے اُن حویلیوں میں کیسے آ پہنچتی تھیں اور کیسے بے غیرت لوگ تھے جو سب کچھ جانتے ہوئے اپنی اُن منہ بند اور شگفتہ کلیوں کو اُن کے پاؤں تلے ڈال دیتے ہیں۔''[۹]

''دیوتا'' ایک ضخیم داستان ہے۔ جس کی تخلیق کا عرصہ تینتیس سال پر محیط ہے۔ اس طویل عرصہ میں پاکستان کے داخلی و خارجی حالات و واقعات میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ''دیوتا'' میں ان حالات و واقعات کی تبدیلیوں اور پاکستانی معاشرے کے مسائل کو بڑی فن کاری اور چابک دستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ''پٹواری'' ہمارے معاشرے کا ایک اہم کردار ہے۔ داستان کا ہیرو ''فرہاد علی تیمور'' جب اپنی زمینوں کے متعلق پٹواری کی ہیرا پھیری دیکھتا ہے تو اپنے غصے کا اظہار یوں کرتا ہے:

''میرے جی میں آیا کہ ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کروں، لیکن میں اپنی دُنیا کے کتنے بے غیرتوں کے منہ پر طمانچے مار سکتا ہوں ایسے کتنے ہی لوگ ہیں جو اندر سے بالکل ننگے ہوتے ہیں اور اُوپر سے عزت کا خول چڑھا کر رکھتے ہیں۔ باہر کی بے عزتی پسند نہیں کرتے اندر کی بے عزتی قبول کرتے ہیں، یہ بہت محترم معظم اور عزت شناس دلال ہوتے ہیں۔''[۱۰]

کسی ملک کے سیاست دان اگر ایمان دار جائز آمدنی پر یقین، ملک اور عوام کے مفاد کو عزیز رکھتے ہیں تو ملک کی تقدیر سنور جاتی ہے، لیکن بدقسمتی سے پاکستان کی اسمبلیوں میں ''مافیا'' کے سرپرست بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ مافیا اتنا طاقت ور ہے کہ ان کی مرضی کے بغیر کوئی قانون پاس نہیں ہو سکتا اور نہ ان کے خلاف کارروائی کرنے کی کسی سیاسی حکومت کو جرأت ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات تو سیاسی حکومتیں ان کے ہاتھوں میں کھیلتی رہتی ہیں۔ ''دیوتا'' میں پاکستانی سیاست دانوں کی ریاکاری کی یوں عکاسی کی ہے:

''دوسرے ممالک کی طرح پاکستان سے منشیات کی لعنت اس لیے ختم نہیں ہوئی کہ ڈرگ مافیا کے سرکردہ افراد اسمبلیوں میں بھی پہنچ جاتے ہیں اور انسدادِ منشیات کی مہم کو ناکام بناتے رہتے ہیں۔''[۱۱]

''شکاری'' ایک پُرعزم نوجوان کی طویل داستان ہے جو پاکستانی معاشرے کے خوف ناک اور ظالم شکاریوں کے چنگل میں پھنس جاتا ہے۔ اس کی زندگی کا ہر لمحہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گزرتا ہے۔ یہ سفاک شکاری کس طرح پاکستانی معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں، دولت کی ہوس نے انہیں ایمان اور حمیت دونوں سے محروم کر دیا ہے۔ پاکستان میں عوام کی محافظ پولیس کا کردار ایک سوالیہ نشان بنتا جا رہا ہے۔ پولیس کا فرسودہ طریقہ تفتیش کس طرح سوہان روح ثابت ہوتا

ہے۔اس کا اظہار داستان کا ہیرو ''سکندر بخت'' یوں کرتا ہے:

''ایک بار پھر مجھے تمام کپڑوں سے محروم کر کے کرسی کے ساتھ یوں جکڑ دیا گیا کہ سر کے سوا میں جسم کے کسی حصے کو جنبش تک نہیں دے سکتا تھا۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ سرِ عام بے لباس ہوتے ہی آدمی خود اپنی نظر میں کتنا بے آبرو ہو جاتا ہے، کتنا گر جاتا ہے اور عزتِ نفس نہ رہے تو خود اعتمادی بھی نہیں رہتی۔ بے عزت کر کے ننگا کر دینے کا یہ نفسیاتی حربہ کسی بھی شریف آدمی کی ذہنی قوت مزاحمت کو شکست دے سکتا ہے۔''[۱۲]

پاکستانی معاشرے میں اکیلی عورت کو جینے کے لیے کن صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔''شہلا'' اپنے دُکھ کا اظہار یوں کرتی ہے:

''تمہارا یہ مہذب معاشرہ اکیلی عورت کو عزت سے جینے کا حق نہیں دیتا۔''[۱۳]

پاکستانی معاشرے میں ہنرمند افراد کے پیشے ہی اُن کی شناخت بن گئے ہیں۔ اُن کو معاشرے میں وہ عزت و احترام نہیں دیا جاتا جس کے وہ مستحق ہیں۔ ترکھان کے بارے میں ہمارے معاشرتی رویے کی عکاسی ان الفاظ میں کی ہے:

''وہ ایسا زبردست فنکار تھا کہ باہر شاید اس کے شاہکار موتیوں سے تُل کے بکتے، لیکن یہاں اسے بمشکل اتنا نصیب ہوتا تھا کہ وہ پیٹ بھر سکے۔ آج بھی یہاں ایسے لوگوں کی کیا اوقات ہے اور کیا عزت ہے وہ ترکھان ہی کہلاتے ہیں اور کم حیثیت ہی سمجھے جاتے ہیں۔''[۱۴]

''موت کے سوداگر'' اپنے وقت کی مقبول داستان ہے۔ پاکستان میں منشیات کی تجارت کی کس طرح بین الاقوامی سرپرستی کی جارہی ہے۔''ڈرگ مافیا'' پاکستانی معاشرے کی رگوں میں کس طرح ہیروئن کا زہر اُتار رہا ہے۔ داستان گو نے بڑی مہارت اور فن کاری کے ساتھ اس طرح کے واقعات کی عکاسی کی ہے۔

پاکستانی قبائل محبِّ وطن ہیں، لیکن ان میں کچھ لوگ مجرمانہ ذہنیت کے حامل بھی ہیں۔ منشیات کی تیاری کے سلسلے میں یہ قبائلی علاقے بہت مشہور ہیں۔ انہیں قبائل سے تعلق رکھنے والا موت کا سوداگر ''پائندہ گل'' بھی ہے۔ اس کا نقش یوں اُتارا ہے:

''سردار پائندہ گل کی زاہدانہ وضع قطع ایک بہروپ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ باریش پُرنور اور متشرع نظر آنے کے باوجود وہ مے نوشی جیسی قبیح عادت میں مبتلا تھا جو شرعاً حرام تھی۔ شاید وہ عادت یا روایات کے تحت نمائشی ملائیت کی نقاب اوڑھنے پر مجبور تھا ورنہ اس کی روزی کا انحصار ہیروئن کی آمدنی پر تھا۔''[۱۵]

داستان کا ہیرو ''تنویر علی عرف ڈینی'' پاکستانی معاشرے کو ہیروئن کی لعنت سے بچانے کے عزم کا اظہار کرتا ہے تو منشیات کی تجارت کرنے والی تنظیم کا نمائندہ پاکستانی معاشرے اور قانون کی عمل داری کا یوں مذاق اڑاتا ہے:

''تم کس معاشرے کی بات کر رہے ہو۔ یہاں تو ہر طرف جنگل کا قانون رائج ہے زبردست چھائے ہوئے ہیں زیردست کچلے جا رہے ہیں ہر ایک خودغرضی میں مبتلا ہے۔''[۱۶]

منشیات کے یہ تاجر پاکستان میں عدم استحکام پیدا کر کے اپنے کاروبار کیلئے فضا ساز گار بنانا چاہتے ہیں۔ اپنے مفاد کیلئے خون کی ہولی بھی کھیلنا پڑے تو اس سے دریغ نہیں کرتے۔ یہ وطن دشمن عناصر اپنے آلہ کاروں کو اس طرح کے احکامات دیتے ہیں:

''ہر ہوشخص جو میری آواز سن رہا ہے یہ سمجھ لے کہ یہ ڈی۔ڈی کا پیغام ہے آج جس نے ذرا بھی سستی دکھائی اُس کی کھال گرا دی جائے گی۔ اپنی ٹولیوں کے ساتھ چہروں پر نقاب لگا کر گاڑیوں میں نکلو اور جو سامنے آئے اُسے خاک وخون میں نہلا دو آج شہر میں اتنی لاشیں گراؤ کہ انہیں اُٹھاتے اُٹھاتے عبدالستار ایدھی کی جان آدھی رہ جائے۔''[۱۷]

ہمارے معاشرے میں ''طوائف'' کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔طوائف کی گناہ آلود زندگی سے کراہت تو سب کرتے ہیں، لیکن بچانے کی کوشش کوئی نہیں کرتا اور اگر کوئی شخص جرأت کر کے اُسے گناہ آلود زندگی سے نکال کر بیوی کے پاکیزہ رشتے کا روپ دے بھی دے تو رشتہ دار اور معاشرے کے افراد کسی بھی صورت میں اس عمل کو دل سے قبول نہیں کرتے۔'' موت کے سوداگر'' داستان میں اسی واقعہ کی عکاسی کی گئی ہے۔ داستان کی ہیروئن غزالہ کہتی ہے:

''انسان خدا کو ناراض کر کے اس کی زمین پر سدا سکھی رہ سکتا ہے، لیکن اپنے جیسے انسانوں اور رشتے داروں کی مرضی سے انحراف کرنے کے بعد وہ زندگی بھر تڑپتا اور بلبلاتا ہی رہتا ہے۔''[۱۸]

مغرب کے مقابلے مشرق میں حیا اور وفا کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔مشرق کی محبت اور چاہت کا انداز بھی نرالا ہے۔ داستان کی ہیروئن ''غزالہ'' ایک مشرقی لڑکی ہے۔ یہ مشرقی لڑکی اپنی محبت کے فلسفے کو یوں بیان کرتی ہے:

''یہ وہ چراغ ہوتا ہے ڈینی جو ایک بار جل اُٹھے تو پھر امر ہو جاتا ہے۔محبت تو زندگی بھر کا روگ ہوتی ہے جو قبر کے کیڑے بھی نہیں مٹا سکتے۔''[۱۹]

پاکستانی داستانوں کی مقبولیت کی بڑی وجہ بھی یہی ہے کہ داستان نگاروں نے کمالِ فن کے ساتھ قاری کو تفریح طبع کے ساتھ ساتھ زمینی حقائق سے بھی آگاہ کیے رکھا۔ یہ داستانیں قاری کو تخیل کی دنیا کی سیر کراتے ہوئے بھی زمینی حقیقتوں سے جوڑے رکھتی ہیں۔ ان داستان نگاروں نے پاکستان کے داخلی اور خارجی مسائل کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ معاشرے کی خامیوں اور خوبیوں کی نشان دہی نے ان داستانوں کو معنی خیز اور فکر انگیز بنا دیا اور اس سے اُردو داستان کو بھی نئی زندگی مل گئی۔

حوالہ جات:

۱۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، ''اُردو داستان''، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء، ص: ۵۱۸
۲۔ بانو قدسیہ، ''حاصل گھاٹ''، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، طبع چہارم، ۲۰۰۷ء، ص: ۷
۳۔ آرزو چودھری، ڈاکٹر، ''عالمی داستان''، لاہور: عظیم اکیڈمی اُردو بازار، ستمبر ۱۹۹۵ء، ص: ۶
۴۔ اقلم علیم، ''مفرور'' (چھٹا حصہ)، کراچی: کتابیات پبلی کیشنز، بار اوّل، ۱۹۸۵ء، ص: ۵۰
۵۔ ایضاً، ص: ۱۹۶
۶۔ جبار توقیر، ''گمراہ'' (پہلا حصہ)، کراچی: کتابیات پبلی کیشنز، بار اوّل، ۱۹۸۴ء، ص: ۱۰۰
۷۔ ایضاً، ص: ۱۱۳
۸۔ ایضاً، ص: ۱۳۵

۹۔ جبار توقیر، ''گمراہ'' (حصہ سوم)، کراچی: کتابیات پبلی کیشنز، بار اوّل، ۱۹۸۴ء، ص: ۱۴۶
۱۰۔ محی الدین نواب، ''دیوتا'' (حصہ اوّل)، کراچی: کتابیات پبلی کیشنز، س ندارد، ص: ۴۸۔۴۹
۱۱۔ محی الدین نواب، ''دیوتا'' (پینتیسواں حصہ)، کراچی: کتابیات پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء، ص: ۲۷۰
۱۲۔ احمد اقبال، ''شکاری'' (پہلا حصہ)، کراچی: کتابیات پبلی کیشنز، بار اوّل، ۱۹۸۵ء، ص: ۵۳
۱۳۔ احمد اقبال، ''شکاری'' (دوسرا حصہ)، کراچی: کتابیات پبلی کیشنز، بار اوّل، ۱۹۹۸ء، ص: ۵
۱۴۔ احمد اقبال، ''شکاری'' (سولہواں حصہ)، کراچی: کتابیات پبلی کیشنز، بار اوّل، ۱۹۹۹ء، ص: ۳
۱۵۔ اقلیم علیم، ''موت کے سوداگر'' (بارہواں حصہ)، کراچی: کتابیات پبلی کیشنز، بار اوّل، ۲۰۰۴ء، ص: ۱۹۲
۱۶۔ اقلیم علیم، ''موت کے سوداگر'' (دوسرا حصہ)، کراچی: کتابیات پبلی کیشنز، بار اوّل، ۱۹۹۸ء، ص: ۲۴۸
۱۷۔ اقلیم علیم، ''موت کے سوداگر'' (بارہواں حصہ)، کراچی: کتابیات پبلی کیشنز، بار اوّل، ۲۰۰۴ء، ص: ۱۹۶
۱۸۔ اقلیم علیم، ''موت کے سوداگر'' (بارہواں حصہ)، کراچی: کتابیات پبلی کیشنز، بار اوّل، ۲۰۰۴ء، ص: ۵۹
۱۹۔ اقلیم علیم، ''موت کے سوداگر'' (چھٹا حصہ)، کراچی: کتابیات پبلی کیشنز، بار دوم، ۲۰۰۷ء، ص: ۶۰